درس ۱۷

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر
قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصَّف

—— (۳) ——

نبیّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین

اَحۡمَدُہٗ وَاُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ —— اَمَّا بَعۡدُ :

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ —— بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۝ ﴾ (الصف : ۹) —— صَدَقَ اللّٰہُ الۡعَظِیۡمُ

سورۃ الصف کی یہ آیت' جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' باعتبارِ مضمون اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا عمود معیّن ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عرض کی جاچکی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بڑا اور مرکزی حصہ جوں کا توں قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس تکرار اور اعادے سے دراصل اس مضمون کی اہمیت کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ یقیناً قرآن مجید میں بعض الفاظ یا مضامین کا بار بار آنا اُن کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اِزَالَۃُ الۡخِفَا عَنۡ خِلَافَۃِ الۡخُلَفَاءِ" میں قرآن کریم کی اہم

ترین آیات میں سے شمار کیا ہے۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے تعیّن میں اس آیۂ مبارکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اسے "اسلامی انقلاب" کے لئے عنوان قرار دیا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بات نقل کی ہے' اگرچہ میں خود اس کی تصدیق نہیں کرپایا' کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کے لئے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے۔ اور اس میں تو ہرگز شک نہیں کہ سیرتِ محمدیؐ کو سمجھنے اور حضور ﷺ کے کارنامۂ حیات کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے کہ آپؐ کی عملی جدّوجُہد کن کن مراحل میں سے ہو کر گزری' کہاں سے سفر شروع ہوا اور کہاں پر ختم ہوا' اس آیت کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کو سمجھنے میں لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حضور ﷺ کو اگر صرف دوسرے انبیاء پر قیاس کیا جائے تو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

مستشرقین کی کوتاہ فہمی

مستشرقین نے بالخصوص اس معاملے میں بڑا دھوکہ کھایا ہے۔ ان کے سامنے نبوّت و رسالت کے آئیڈیل حضرت مسیح یا حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں اور ان کی زندگی میں کسی قتال یا جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ چنانچہ مغربی مفکرین اور مستشرقین کو جنگ و قتال کا معاملہ منصبِ رسالت سے بڑا ہی متصادم نظر آتا ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ٹائن بی کا یہ جملہ بہت مشہور ہے :

"*Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman*"

ان کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا جو نقشہ مکّی دَور میں سامنے آتا ہے صرف وہی نبوّت و رسالت سے مطابقت رکھتا ہے' جبکہ وہاں سے آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی۔ گویا ان کے خیال میں بحیثیتِ نبی اور رسول آپ ﷺ ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ)۔ اس کے برعکس مدنی دَور کا جو نقشہ ان کے سامنے آتا ہے اس میں انہیں آنحضور ﷺ ایک حکمران' ایک مدبّر' ایک سیاست دان اور ایک سپہ سالار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اور اس پہلو سے وہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ کامیابی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کون اندھا ہو گا

کہ جس کی نگاہیں آپؐ کی عظمت کے احساس سے جھک نہ جائیں کہ کامیابی گویا اپنے آخری اور تکمیلی درجے میں محمد ﷺ کے قدم چومتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ گرہ لگادی کہ یہ کامیابی بحیثیت "statesman" تھی' بحیثیتِ نبی نہیں تھی۔ اسی مغالطے کو پیدا کرنے کے لئے سر منٹگمری نے سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا : "Mohammad at Mecca" اور "Mohammad at Madina" اور اس طرح اس نے مکّی اور مدنی دور کے ظاہری تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ حضور ﷺ کی تعریف میں اس نے کہیں بخل سے کام نہیں لیا' بلکہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو نسلِ آدم کے عظیم ترین افراد میں شمار کیا ہے۔ آپؐ کے تدبّر' آپؐ کی فراست' آپؐ کی معاملہ فہمی' آپؐ کی پیش بینی' آپؐ کی دور اندیشی' ان تمام اعتبارات سے اس نے آپؐ کی صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے اور آپؐ کی تعریف میں آخری حد تک چلا گیا ہے۔ لیکن ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس مٹھاس کے اندر اس نے بڑے لطیف پیرائے میں ایک زہر بھی شامل کر دیا ہے۔ وہ زہر یہی ہے کہ وہ لوگ یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ آپؐ کی یہ تمام کامیابیاں ایک سیاست دان اور ایک مدبّر کی حیثیت سے تھیں' نبی کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ یہ سارا مغالطہ اسی بنیاد پر ہے کہ ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے لازمی اور منطقی تقاضے کو نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کے صحیح فہم کے لئے یہ آیۂ کریمہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

رسولِ کامل ﷺ

اس تمہید کے بعد اب ذرا اس آیۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ﴾ "وہی ہے وہ"۔ یہاں اشارہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف۔ اس لئے کہ سورۃ الصف میں جو آیت اس آیت سے متّصلاً قبل وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ "یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں' مگر اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ

کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اس پہلو سے جب "ھُوَ" سے اگلی آیت شروع ہوئی تو متعین ہو گیا کہ اس سے مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ۔

آگے چلئے ﴿ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ ﴾ "(وہی ہے اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو"۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ذکر ہے محمد ﷺ کا۔ عربی زبان میں اَرْسَلَ' یُرْسِلُ' اِرْسَالاً کا مفہوم ہے بھیجنا۔ کسی کو ایلچی بنا کر' سفیر بنا کر یا پیغامبر بنا کر بھیجنا۔ یہاں آنحضور ﷺ کے حوالے سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ مختلف انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کے اسماء کے ساتھ ان کی بعض خصوصی نسبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے ساتھ صفیؓ اللہ کے الفاظ معروف ہیں۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کو نجیح اللہ' حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ' حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ' حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس فہرست میں حضرت محمد ﷺ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" ہی کے الفاظ معروف و مشہور ہیں۔ غور کرنے پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اگرچہ نوحؑ بھی اللہ کے رسول تھے' موسیٰؑ بھی رسول تھے' عیسیٰؑ بھی اللہ کے رسول تھے' لیکن اس لفظ "رسول" کا مصداقِ کامل اور مصداقِ اَتم ہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ۔ رسالت کا ادارہ تکمیل کو پہنچا ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں۔ گویا آپؐ کا امتیازی لقب یا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ آپؐ "رسول اللہ" ہیں۔ سورۃ الفتح میں آپؐ کی اسی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے : ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ اس میں گویا اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی جانب پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ رسالت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں!

"الْهُدٰى" اور "دِيْنِ الْحَقِّ"

اب آگے بڑھئے : ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ﴾ حرفِ "ب" عربی میں کسی چیز کی معیت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے : (۱) الھدیٰ اور (۲) دین الحق۔ الھدیٰ سے مُراد ہے ہدایتِ کاملہ' وہ کتابِ ہدایت کہ جس نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو

اپنے اندر جمع کرلیا ہو' سمیٹ لیا ہو' سمو لیا ہو۔ اس کی تعیین کے ضمن میں اگر قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس سے مراد خود قرآن ہے۔ اس لئے کہ اسی قرآن کے لئے سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی کو "هُدًى لِّلنَّاسِ" قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی قرآن ہے جس کے بارے میں سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا : ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ﴾ تو معلوم ہوا کہ الہدیٰ سے مراد ہے قرآن حکیم!

اب آگے بڑھیے! دوسری چیز جو آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا وہ دینِ حق ہے۔ یہاں "دین الحق" عربی نحو کے اعتبار سے مرکب اضافی کی شکل میں ہے۔ اِس اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے "حق کا دین" تاہم عربی میں بعض اوقات مرکب توصیفی' مرکب اضافی کی شکل میں آ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا : حق دین یا سچا دین۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لئے کہ اسے اگر حق کا دین قرار دیں تو قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ کو "الحق" کہا گیا ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ مجسّم حق اور کامل حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ گویا "حق کا دین" کے معنی ہوں گے اللہ کا دین۔ اور اگر اسے مرکبِ توصیفی مان کر "سچا دین" ترجمہ کیا جائے تو بھی بات وہیں جا پہنچے گی' اس لئے کہ سچا ترین دین تو اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ کے دین سے کیا مراد ہے؟ لفظ دین پر غور کیجئے! یہ لفظ اس سے پہلے ہمارے اسباق میں سورۃ الفاتحہ کے درس میں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے ضمن میں زیر بحث آ چکا ہے۔ اُس وقت عرض کیا گیا تھا کہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جزا و سزا اور بدلہ۔ مشہور مصرع ہے ع دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا۔ کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان سے کر دیا۔ یعنی ہم نے ان کے عمل کا انھیں پورا پورا بدلہ دے دیا ہے۔ اسی طرح ایک معروف کہاوت ہے : "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ عربی زبان میں "دَيْنٌ" کہتے ہیں قرض کو' کہ وہ لوٹ کر آتا ہے۔ جس طرح کسی عمل کی جزا عمل کرنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے اسی طرح "دین" (قرض) دینے

والے کو واپس ملتا ہے۔ تو دین کے اصل لغوی معنی بدلے اور جزا و سزا کے ہیں۔ لیکن قرآن مجید نے جب اس لفظ کو اس اصل لغوی اساس سے اٹھا کر اسے اپنی ایک اصطلاح بنایا تو اس میں ایک اضافی مفہوم شامل ہو گیا۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں لفظ دین بالعموم قانون' ضابطہ اور شریعت کے معنوں میں آتا ہے' اس لئے کہ جزا و سزا کے ساتھ کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ پھر اس میں اضافی مفہوم پیدا ہوا اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں متعدد بار "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی "اطاعت کو اس (اللہ ہی) کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ اس لئے کہ کسی قانون یا ضابطے کی اگر اطاعت کی جائے گی تو جزا ملے گی' اور اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو سزا ملے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے جب اسے دِيْنُ اللّٰهِ (النصر : ۱) کی مرکب شکل میں ایک گھمبیر اصطلاح کا درجہ دیا تو اس میں جو مفہوم پیدا ہوا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے! کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کے قانون کے تحت جو زندگی بسر کی جائے گی وہ زندگی گویا اس کے دین کے اندر رہتے ہوئے گزاری جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کا گھمبیر' ہمہ گیر اور جامع تصور جسے قرآن مجید نے ایک بہت اہم اصطلاح کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں غور کیجئے کہ اگر کسی جگہ بادشاہت کا نظام قائم ہے' ایک فردِ واحد کو ہی حاکم مطلق (soverign) ہونے کی حیثیت حاصل ہے' اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے تو یہ گویا کہ "دِيْنُ الْمَلِک" ہے۔ اس لئے کہ اس نظام میں بادشاہ مطاعِ مطلق ہے۔ یہ لفظ بعینہ اسی مفہوم میں سورۃ یوسف میں وارد ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کے ضمن میں "دِيْنُ الْمَلِک" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ واقعہ لمبا ہے' مختصراً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور ان کے بھائی قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کے پاس غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے' تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو' جسے انہوں نے خاص طور پر فرمائش کر کے بلوایا تھا' اپنے پاس روکنا چاہا' لیکن چونکہ انہوں نے خود کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا تھا' بلکہ بھائی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کا

واسطہ جس "عزیزِ مصر" سے ہے وہ ان کا بھائی یوسف ہے' لہٰذا بن یامین کو اپنے پاس روکنے کا کوئی معقول سبب بظاہر بجھائی نہیں دیتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص طریقہ سجھایا اور ایک خصوصی تدبیر کے ذریعے وہ اپنے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۃ یوسف میں اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ﴿ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ﴾ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے اس بادشاہی نظام کے اندر رہتے ہوئے (جس میں وہ خود ایک اہم عہدہ پر فائز تھے) یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی بن یامین کو روک سکتے! تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی فردِ واحد کو مختارِ مطلق اور مطاعِ مطلق مان کر اس کے تحت جو اجتماعی نظام کسی جگہ پر قائم ہو گا اسے دینُ المَلِک کہا جائے گا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آپ دورِ جدید کے مقبول ترین نظام یعنی جمہوریت کو' "دین الجمہور" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نظام میں اصل حاکمیت جمہور کی ہے۔ ان کے نمائندے کثرتِ رائے سے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں ناجائز قرار دے دیں۔ یہ ایک مکمل نظام ہے' پورا دین ہے' جسے بجا طور پر دین جمہور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر پر غور کیجئے کہ "دین اللہ" اور "دین حق" کا مفہوم کیا ہو گا! وہ نظام جس میں اللہ ہی کو مطاع مطلق تسلیم کیا جائے' حاکمیتِ مطلقہ (Sovereignty) صرف اسی کے لئے ہو ع

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

اس اصول پر مبنی پورے نظامِ زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ استوار ہو گا وہ کہلائے گا "دین اللہ"۔ یہ "دین اللہ" یا "دین حق" ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ وہ دوسری چیز ہے جو آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ ذہن نشین کر لیجئے! پہلی چیز جو آپؐ کو عطا ہوئی وہ ہے "الھدیٰ" یعنی قرآن حکیم اور دوسری شے جو دے کر آپؐ مبعوث فرمائے گئے اسے قرآن نے "دِین الحق" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی عدل و قسط پر مبنی ایک مکمل نظامِ اجتماعی' ایک مکمل ضابطہ حیات' ایک کامل نظامِ اطاعت جس میں

زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ضابطہ و قانون موجود ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال یہ آسکتا ہے کہ کیا قرآن میں کامل نظام نہیں ہے؟ "الہدیٰ" کے بعد حرف "و" واوِ عطف ہے اور واوِ عطف مغائرت کا متقاضی ہے۔ پھر "دین الحق" قرآن سے کوئی جدا شے ہے؟ تو واقعہ یہی ہے کہ صرف قرآن پر مبنی کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں صرف اصول دیئے گئے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے کے متعلق صرف حدود کو معین کر دیا گیا ہے۔ ایک مکمل نظام اگر بنتا ہے تو وہ قرآن پر سُنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بنتا ہے۔ اس خاکے کے اندر اگر رنگ بھرا جا سکتا ہے تو وہ سُنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بھرا جا سکتا ہے۔ ایک مکمل نظام کی تشکیل کتاب اور سُنّت دونوں کے مجموعے سے ہوگی۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان کی جو بھی کبھی کوئی دستوری دستاویز بنی ہے تو اس میں یہ الفاظ صحیح طور پر شامل ہوئے ہیں :

> *"NO LEGISLATION WILL BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH"*

اس لئے کہ قرآن و سُنّت کے اجتماع ہی سے دین حق مکمل ہوتا ہے اور ایک پورا نظام تشکیل پاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لئے وقت کی تعیین!

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اب ذرا ذہن کے سامنے ایک سوالیہ نشان لائیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا وقت معین کرنے میں اللہ کی کون سی حکمت تھی؟ اس کی تفتیش کیجئے تو عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر نسل انسانی کی تاریخ اور تاریخ نبوت دونوں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہی نہیں پہلے نبی بھی تھے۔ انسانیت اور نبوت کے یہ قافلے ساتھ ساتھ چلے ہیں اور دونوں قافلوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ انسان نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اور نبوت و رسالت میں بھی ایک ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان

نے آج سے چودہ سو برس پہلے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر اپنی جوانی میں قدم رکھا ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ آتے ہیں : "حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ" (جب وہ شخص اپنی پوری قوت' اپنی پختگی کو پہنچ گیا)۔ تو نسل انسانی بحیثیت مجموعی دو اعتبارات سے ایک بلوغ اور پختگی کو پہنچی ہے اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ انسانی ذہن اور اس کے فکر و شعور کے ارتقاء کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ اور جس طرح ایک بچے پر عہدِ طفولیت کے بعد لڑکپن' جوانی اور عقل کی پختگی کے سارے ادوار آتے ہیں اسی طرح نسل انسانی ان تمام مراحل سے گزری ہے۔ انسان کو کامل اور مکمل ہدایت روزِ اوّل سے نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ "نعوذ باللہ من ذالک" اس وقت اللہ کے پاس تھی نہیں۔ اللہ کے پاس تو تھی' لیکن انسان ابھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو حاصل کر سکتا۔ ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ ابھی اس سطح تک نہ پہنچا تھا کہ اس کو ابدی ہدایت نامے کا اہل سمجھا جاتا۔ للہذا عبوری دور میں ہدایات دی جاتی رہیں' کتابیں نازل ہوتی رہیں' صحیفے اترتے رہے' ابتدائی احکام دیئے جاتے رہے' تاآنکہ انسان اپنی عقل و شعور کی پختگی کو پہنچ گیا۔ اور فکر کی سطح کے اعتبار سے اس کا اہل ہو گیا کہ ابدی ہدایت نامہ اب اسے دے دیا جائے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔

نوعِ اِنسانی کی ذہنی و فکری بلوغت کا دَور

میں یہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ معروف تو کچھ دوسرے اعتبارات سے تھے' انہوں نے علامہ اقبال کی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے مل سکا ہوں ان میں مجھے اپنے محدود علم کے مطابق فلسفہ' تاریخ فلسفہ' تاریخ مذاہب اور منطق وغیرہ میں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان کی ٹکر کا نہیں ملا۔ انہوں نے ایک روز بر سبیل تذکرہ یہ بات کہی کہ نسل انسانی کی تاریخ کے بارہ سو برس بڑے اہم اور بہت productive ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بارہ سو سال کے دَوران انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا اور اس کی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ چکی۔ یہ ہیں چھ سو قبل مسیح سے لے

کرچھ سو بعد مسیح تک کے بارہ سو برس' جن کے دَوران تمام مکتبہ ہائے فکر' تمام مدارسِ فلسفہ اور تمام مذاہب جو بھی پیدا ہونے تھے ہو چکے' اس کے بعد کوئی نیا مذہب اور کوئی نیا فلسفہ وجود میں نہیں آیا۔ دَورِ حاضر میں یہ سارے جو نام لئے جاتے ہیں اور بڑی بھاری بھرکم اصطلاحات میں جو نئے فلسفے مغرب کے سمجھے جاتے ہیں' وہ logical positivism ہو یا existentialism ہو' یہ سب نئے لیبلوں سے نئی بوتلوں میں پرانی شرابوں کے سوا کچھ نہیں۔ انسان جو کچھ بحیثیتِ انسان سوچ سکتا تھا وہ چھ سو بعد مسیح تک سوچ چکا تھا اور اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ چشتی صاحب مرحوم سے یہ بات سن کر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا گہرا تعلق ہے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے زمانے اور وقت کے تعیّن کے ساتھ کہ جب انسان سوچ چکا جو کچھ کہ وہ سوچ سکتا تھا۔ سقراط' ارسطو اور افلاطون اپنے نظریات دنیا کے سامنے رکھ چکے۔ فلاسفہ ہند نے عقل کی جو بھی جولانیاں ہو سکتی تھیں وہ دکھالیں۔ فلاسفۂ یونان اور فلاسفۂ چین اور ایران انسان کو جو کچھ دے سکتے تھے دے چکے۔ تب وہ الکتاب اور الھدیٰ اس دعوے کے ساتھ نازل ہوئی کہ یہ ہدایتِ تامہ ہے' یہ آخری اور مکمل ہدایت ہے جو اب انسان کو دی جا رہی ہے۔ اور آپ غور کیجئے' اس سے بڑا گہرا تعلق ہے اس حقیقت کا کہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے' از روئے الفاظ قرآنی : ﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ سوچئے' تورات بھی اللہ ہی کی کتاب تھی' اگر اللہ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا تو کیا اس میں تحریف ممکن ہوتی؟ بلکہ میں اس کے برعکس یوں کہوں گا کہ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن مجید کو بخش دیتے! کیا اُمّتِ مسلمہ اس میں تحریف نہ کر دیتی؟ کیا معنوی تحریف ہمارے ہاں نہیں ہوئی؟ یہ حفاظت خصوصی قرآن کو دی گئی اور تورات' زبور اور انجیل کو نہ دی گئی اس کا کیا سبب ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی جناب میں یہ شکوہ کریں کہ پروردگار! یہ ہم سے سوتیلی بیٹیوں والا معاملہ کیوں ہوا؟ ہم بھی تیری کتابیں تھیں' ہمیں تو نے تحفظ کیوں نہ دیا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ابھی عبوری دَور کی ہدایات تھیں جب نسل انسانی ابھی عقل اور شعور کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس

عبوری دَور کی حفاظت لازمی نہ تھی۔ ان کو مستقل بنانا اور محفوظ رکھنا ضروری نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی کتاب ہے جس کے سابقہ ایڈیشن پہلے دیئے گئے اور اسی کا کامل اور مکمل آخری ایڈیشن ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا۔

اجتماعی شعور کی پختگی

اب آیئے دوسرے مضمون کی طرف "دِیْنِ الْحَق" کے الفاظ میں درحقیقت نسل انسانی کے ایک اور اعتبار سے بلوغ کو پہنچنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر اشارے کئے گئے ہیں کہ انسان نے انفرادیت سے تدریجاً اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی صرف ایک قبیلے کی زندگی تھی' پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں' پھر بڑی بڑی مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ عظیم سلطنتوں کا دَور تھا جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اس وقت قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں قائم تھیں جن کے مابین تاریخ کئی سو برس سے جھولا جھول رہی تھی۔ ان سلطنتوں کی لکھوکھا کی تعداد میں standing armies تھیں۔ یہ تربیت یافتہ مسلح افواج تھیں۔ یہ وہ دَور تھا جبکہ محمدِ عربی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔ گویا کہ انسان اجتماعی اعتبار سے بھی اب اس سطح پر آ گیا تھا کہ اس کی ضرورت اب ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ صرف انفرادی اخلاقیات اب اس کی ضرورت کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ انفرادی اخلاقیات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اب ضرورت تھی ایک اجتماعی نظام کی' ایک ایسے نظامِ عدل و قسط کی جس میں انسانی زندگی کے جو بھی متصادم (conflicting) تقاضے ہیں ان کو اس طریقے سے سمو دیا جائے کہ ان میں اعتدال بھی ہو اور توازن بھی ہو' کوئی تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے نیچے دب نہ جائے' انفرادیت بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعیت کے حقوق بھی محفوظ رہیں۔ مرد کی قوامیت بھی مجروح نہ ہو اور عورت کے حقوق بھی اس طرح پامال نہ ہو جائیں کہ وہ بھیڑ بکری کی طرح صرف ملکیت بن کر رہ جائے۔ اسی طریقے سے زندگی کے اندر جو مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور جو مختلف نزاعات وجود میں آ چکے تھے انسان کو ان سب کا ایک معتدل اور متوازن حل درکار تھا۔ یہ ہے اس دور کے

انسان کی اصل ضرورت! اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ وہ ایک دین لے کر آئے' ایک نظام لے کر آئے۔ یہ نظام اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام ہے اور یہ توازن اور اعتدال کی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ یہی توازن اور اعتدال ہے جس کی وجہ سے سورۃ الحدید میں اس دین حق کو "المیزان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میزان ہے' یہ تول دینے والی شے ہے' افراد کے حقوق کو معین کرنے والی' عورت اور مرد کے حقوق واختیارات اور فرائض کو معین کرنے والی اور تول دینے والی۔ یہ فرد اور اجتماعیت کے مابین اور سرمائے اور محنت کے مابین توازن پیدا کرنے والی میزان ہے' جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دین حق کی شکل میں دے کر بھیجا گیا۔

لِیُظْهِرَهٗ کا مفہوم

اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "تا کہ وہ غالب کر دے اس کو"۔ اس میں جو ضمیریں وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں مفسرین کے ہاں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا ہمیں تفصیلاً تجزیہ کرنا ہو گا۔ ایک ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے کہ "تا کہ اللہ غالب کر دے اس دین کو"۔ اسی طرح یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ "تا کہ اللہ غالب کر دے محمد (ﷺ) کو"۔ اور ایک ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے "تا کہ محمدؐ غالب کر دیں اس دین کو!" ضمیر فاعلی اور ضمیر مفعولی کے مراد مختلف معین کرنے کی وجہ سے درحقیقت ترجموں میں یہ فرق واقع ہوا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی فرق کے باوجود اس کے اصل مفہوم اور معنی میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لفظ "اظہار" پر غور کیجئے۔ ظَهَرَ یَظْهَرُ کا مفہوم ہے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا۔ اور اسی میں ایک مفہوم غالب ہو جانے کا بھی شامل ہے' اس لئے کہ کوئی چیز نمایاں اور ظاہر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے ماحول پر غالب ہوتی ہے۔ اسی سے بابِ افعال میں مصدر بنا "اظہار" یعنی غالب کر دینا۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں ظهر کہتے ہیں پیٹھ کو۔ کسی کی پیٹھ پر سوار ہو جانا اس پر غالب ہونے کے مترادف ہے۔ تو اظہار کا یہ مفہوم مسلّم ہے۔

لِیُظْهِرَہٗ کی ضمیرِ فاعلی کے بارے میں جو دو رائیں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کا مدلول ایک ہی ہے۔ چنانچہ "غالب کرنے والا" خواہ اللہ کو قرار دیا جائے خواہ رسول ﷺ کو' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بظاہر ہم محنت و مشقت سے روزی کماتے ہیں' لیکن ہمارا رازق اللہ ہی ہے۔ انسان تو محض کاسبِ اعمال ہے' خالق اعمال صرف اللہ ہے۔ چنانچہ اس عمل "اظہار" کے کرنے والے عالمِ اسباب میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں' اور عالمِ حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ لہٰذا مراد اور معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح کہ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ﴿ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ کہ اے مسلمانو! یہ ستر سردارانِ قریش جو تمہارے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے ہیں' انہیں تم نے قتل نہیں کیا' بلکہ در حقیقت اللہ نے انہیں قتل کیا ہے' اور اے نبی وہ مٹھی بھر کنکر جو آپ نے پھینکے تھے لشکر کفار کی طرف تو وہ آپ نے نہیں پھینکے تھے' اللہ نے پھینکے تھے۔ معلوم ہوا کہ عالم واقعہ میں یا بالفاظِ دیگر عالم اسباب میں غلبۂ دین کے لئے محنت' جدوجہد' سرفروشی اور جہاد و قتال کرتے نظر آتے ہیں محمد ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار' لیکن حقیقت کی سطح پر فاعل حقیقی صرف اللہ ہے۔ اسی طرح کا معاملہ لِیُظْهِرَہٗ میں شامل ضمیر مفعولی کا ہے۔ چنانچہ اس سے خواہ دین کو غالب کرنا مراد لیا جائے چاہے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو' مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد کا مقصود ہرگز اپنی ذات کا غلبہ نہ تھا۔ یہ بھاگ دوڑ اور سعی و جہد اپنی یا اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کیلئے ہرگز نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا غلبہ در حقیقت اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ لہٰذا لفظی ترجمہ چاہے جو بھی کیا جائے اور ضمیروں کے مراجع کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے قائم کی جائے' مفہوم ایک ہی رہے گا۔

اب تک اس آیۂ مبارکہ میں جو کچھ مضمون آیا ہے اسے ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول کو دو چیزیں دے کر (۱) الہدیٰ اور (۲) دین حق۔ کیوں بھیجا؟ اس کا جواب در حقیقت اس لفظ لِیُظْهِرَہٗ میں بیان ہوا ہے۔ اس لئے بھیجا تاکہ اس دین حق کو

غالب کر دے پورے نظامِ زندگی پر (عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ)۔ لفظ دین کے ترجمہ میں بھی ہمارے ہاں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض لوگوں نے "تمام ادیان" ترجمہ کر دیا ہے' بعض نے "سب دین" ترجمہ کیا ہے' اسی طرح بعض لوگوں نے اس سے "کل دین" اور بعض نے "جنس دین" مراد لیا ہے۔ یہ مؤخر الذکر ترجمہ در حقیقت اصل مفہوم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ گویا اس کا اصل مفہوم اور معنی یہ ہو گا کہ یہ دین حق غالب ہو جائے پورے جنس دین پر' پورے نظام زندگی پر اللہ کا نظام اس شان سے قائم ہو جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل و قسط زندگی پر بحیثیت ایک وحدت اور ایک "organic whole" کے نافذ و غالب ہو جائے۔ یہ ہے مقصد محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا۔

"دین" اور "مذہب" میں فرق

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ لفظ "مذہب" اور لفظ "دین" میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اور حدیث کے پورے ذخیرے میں اسلام کے لئے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا' بلکہ اس کے لئے ہمیشہ "دین" ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں فرمایا گیا : ﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ کہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول دین تو صرف اسلام ہے۔ دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجئے! مذہب ایک جزوی حقیقت ہے۔ یہ صرف چند عقائد (dogma) اور کچھ مراسمِ عبودیت (rituals) کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہو گا کہ اسلام مذہب نہیں ہے' اس لئے کہ مذہب کے جملہ elements بھی اسلام میں شامل ہیں' اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے' ایمانیات ہیں' پھر اس کے مراسم عبودیت ہیں' نماز' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے' چنانچہ صحیح یہ ہو گا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں' ایک دین ہے۔

اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں یہ ایک مکمل نظامِ زندگی بھی ہے۔ بلکہ اصلاً یہ دین ہے۔

اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے! کسی ایک خطۂ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہو سکتے ہیں' لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ نظام تو ایک ہی ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ درانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطۂ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت (Sovereignty) تو کسی ایک ہی کی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہو جائیں۔ نظام ایک ہی رہے گا۔ اللہ کا نظام ہو گا یا غیر اللہ کا ہو گا۔ نظام دو نہیں ہو سکتے' جبکہ ایک خطۂ زمین میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں[1] ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک نظام غالب و برتر ہو' اور وہی حقیقت میں "نظام" کہلائے گا' اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ ہے درحقیقت ایک امکانی حالت! میرا ذہن منتقل ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف کہ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

دین کب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے؟

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا' بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اسلام کے دَورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا' لیکن اس دین کے تابع یہودیت' مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا

---

[1] یہ بات اس حقیقت سے بہت مشابہ ہے جو ایک کہاوت کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ دس درویش ایک گدڑی میں گزارا کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں اکٹھے نہیں رہ سکتے!

گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا ہو گا اور چھوٹے بن کر رہنا ہو گا ﴿ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ﴾ (التوبۃ : ۲۹) ملکی قانون (law of the land) اللہ کا ہو گا' غالب نظام اللہ کا ہو گا' اس کے تحت اپنے پرسنل لاء میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہو گی۔ اسلام کے دورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہو گئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر میں دین انگریز کا تھا' law of the land اس کا تھا۔ دینِ انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی کہ نمازیں جیسے چاہو پڑھو' انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا' اذانیں بخوشی دیتے رہو' وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کر لو' لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہو گا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی sovereignty کے تحت ہو گا' اس میں تم مداخلت نہیں کر سکتے! یہ تھا وہ تصور جس کے بارے میں اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی۔

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی اسلام آزاد کہاں ہے؟ وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حقیقت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے! اللہ اللہ اور خیر سلا۔

نفاذِ دین کے بغیر اتمامِ حجت ممکن نہیں!

دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ اگر مغلوب ہے تو وہ دین نہیں رہے گا' بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ جائے گا' اور سکڑ جائے گا' اس کی اصل حیثیت مجروح ہو جائے گی۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جا رہا ہو' صرف کتابی شکل میں نسلِ انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنت (utopia) کی شکل تو اختیار کر سکتا ہے' لیکن حجت نہیں بن سکتا۔ نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کر کے' نافذ کر کے اور چلا کر دکھا دیا

جائے۔ یہ ہے بعثت نبویؐ کی وہ امتیازی شان اور کٹھن ذمہ داری جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوئی کہ آپؐ جو دین حق دے کر بھیجے گئے ہیں اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب و قائم اور نافذ و رائج فرما دیں۔ ایک حدیث مبارک میں اس حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا گیا کہ ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) تاکہ اللہ کی بات ہی سب سے بلند ہو' اس کی مرضی سب سے بالاتر ہو اور اس کا جھنڈا سب سے اونچا ہو جائے۔

سورۃ المدّثر میں اس اہم مضمون کو دو الفاظ میں سمو لیا گیا ہے ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ ﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ! کمر بستہ ہو جاؤ' اپنے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا آغاز کرو! اور اس کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ انذار۔ خبردار کرو' اُن نیند کے ماتوں کو جگاؤ' جو بھول گئے ہیں اس حقیقت کو کہ اصل زندگی موت کے بعد ہے ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ "اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا"۔ یہ ہے نبیؐ کے مشن کا نقطۂ آغاز! اور اس کا ہدف مقصود اور اس کی غایت قصویٰ کیا ہے؟ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ "اور اپنے رب کو بڑا کرو!" تکبیر کے معنی صرف یہ نہیں کہ بڑائی کا اعلان یا اعتراف کر لیا جائے' زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے' بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کی بڑائی نافذ کی ہو جائے' اس کی کبریائی کے اعتراف پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے' اسی کی بات سب سے اونچی اور اسی کا حکم سب سے بالا ہو۔ یہ ہے تکبیرِ رب کا حقیقی مفہوم! علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں تکبیرِ رب کے اس انقلابی تصور کو شعر کا لبادہ اوڑھایا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

اسی مضمون کو کسی قدر ظریفانہ انداز میں یوں بیان کیا ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

تکبیرِ رب کا کچھ یہی مفہوم حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ میں بھی سامنے آتا ہے کہ "اے رب! جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔"

دینِ حق کا نفاذ انقلابی جدّوجُہد کا متقاضی ہے

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ الصّف کی زیرِ نظر آیت کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا جو مشن سامنے آتا ہے اس کا تقاضا محض دعوت و تبلیغ' بشارت و انذار یا تعلیم و تربیت سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ ایک انقلابی مشن ہے۔ ایک نظام کو کسی معاشرے پر برپا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے وہاں پر موجود نظام کو جڑوں سے اکھیڑا جائے۔ یہ کام خلا میں کیا جانے والا نہیں ہے۔ جہاں بھی دینِ حق کے نفاذ کی جدّوجہد کی جائے گی کوئی نہ کوئی نظام وہاں پہلے سے موجود ہو گا۔ اس باطل نظام کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں گے۔ سیادتیں اور چودھراہٹیں ہوں گی' لوگوں کے مالی مفادات ہوں گے۔ آپ جب اُس نظام کو ذرا سا چھیڑیں گے' اس کے خلاف ذرا آواز بلند کریں گے تو نہ معلوم کس کس کے کن کن مفادات پر آنچ آئے گی! چنانچہ وہ تمام قوتیں اپنے اس نظام کی مدافعت میں آپ کے خلاف متحد ہو جائیں گی کہ ؏

"نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"

اپنے نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہ سب مجتمع ہو کر آپ کے خلاف صف آراء ہو جائیں گے۔ تصادم' کشمکش اور جہاد و قتال کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا۔ چنانچہ اس مقصدِ بعثت کے اعتبار سے جو سورۃ الصف کی اس آیت میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لئے معین ہوا ہے' انقلابی جدّوجُہد لازم اور ناگزیر ہے۔ یہ محض دعوت و تبلیغ سے ہونے والی بات نہیں!

اگرچہ سورۃ الجمعہ کے حوالے سے اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ اس انقلابی جدّوجہد کا منبع اساسی یقیناً دعوت و تبلیغ ہے' اس کے ابتدائی مراحل میں یقیناً تعلیم بھی

ہے' تربیت بھی ہے اور تزکیہ بھی ہے' لیکن ان ابتدائی اور اساسی مراحل سے بلند تر سطح پر ایک انقلابی جدوجہد بھی ناگزیر ہے۔ ایک تصادم کہ جس میں کشت و خون کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبّہ میں جہاں ہمیں دعوت و تبلیغ کا مرحلہ نظر آتا ہے وہاں جہاد و قتال کے مراحل بھی آئے۔ حنین کی وادی میں آپ یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے لشکر کی کمان کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ ' اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ" یہ وہ بات ہے جو اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جنہوں نے حضور ﷺ کے مقصد بعثت کی اس منفرد اور امتیازی شان کو نہیں سمجھا کہ آپؐ صرف داعی اور مبلغ نہ تھے' آپؐ محض مبشر اور نذیر نہ تھے' آپؐ صرف مزکی' مربی اور معلم نہ تھے' آپؐ تاریخ انسانی کے عظیم ترین انقلاب کے داعی اور نقیب بھی تھے۔ کون انکار کر سکتا ہے اس حقیقت سے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا' جس نے زندگی کے ہر گوشے کو بدل کر رکھ دیا۔ ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے لوگوں کے افکار بدلے' عقائد بدلے' نظریات بدلے' کردار بدلے' حتیٰ کہ لوگوں کے شب و روز کے انداز اور نشست و برخاست کے طریقے بدل گئے۔ وہ قوم کہ جس کے اندر کوئی کسی کی بات سننے والا نہ تھا' انتہائی منظم قوم بن گئی۔ اس معاشرہ نے کہ جہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھے' دنیا کو معلم فراہم کیے۔ نبی اکرم ﷺ نے نوعِ انسانی کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت کا یہ پہلو کہ آپؐ عظیم داعی انقلاب تھے' در حقیقت آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے جو اِن الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا ﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

"اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!"

مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً جارج برنارڈ شا نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ :

"He is a saint among politicians and a politician among saints"

اگرچہ ؏ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مصداق ان الفاظ کی یا ان جیسے الفاظ کی

کوئی دور کی نسبت بھی آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے نہیں ہو سکتی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے فہم کے لئے شاید اگر یوں تعبیر کیا جائے تو بات غلط نہ ہو گی کہ :

"He was a revolutionary among prophets and a prophet among revolutionaries"

یعنی نبیوں اور رسولوں میں آپؐ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ ایک عظیم انقلابی رہنما ہیں' اور انقلابی رہنماؤں میں آپؐ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپؐ نے صرف دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا بلکہ اس دعوت کی بنیاد پر ایک انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے سے کام کا آغاز کیا اور کل ۲۳ برس میں اس جدوجہد کو ایک نظام کے باقاعدہ قیام اور باضابطہ نفاذ کے تکمیلی مرحلے تک پہنچا دیا۔ اگرچہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں آپؐ کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں آتے ہیں۔ زمین پر قدم بقدم چل کر حضور ﷺ نے وہ مرحلے طے کیے۔ آپؐ کو فقر و فاقے کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی' شعبِ بنی ہاشم میں تین سال کی قید کو ذہن میں لائیے کہ جس میں وہ وقت آیا کہ فقر و فاقے کی شدت سے بنی ہاشم کے دودھ پیتے بچے بلک رہے تھے اور ان کے کھانے کے لئے کوئی چیز میسر نہ تھی' سوائے اس کے کہ سوکھے چمڑوں کو اُبال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ طائف میں شدید پتھراؤ کا آپ ﷺ کو سامنا کرنا پڑا۔ مکے کی گلیوں میں آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ یہ منظر بھی چشمِ فلک نے دیکھا کہ آپ ﷺ سربجود ہیں اور ایک شقی انسان عقبہ بن ابی معیط ابوجہل کے کہنے سے اٹھتا ہے اور اونٹ کی نجاست بھری اوجھری لا کر شانۂ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر غارِ ثور کا مرحلہ بھی آیا۔ میدانِ بدر کا وہ نقشہ بھی ذہن میں لائیے کہ اللہ کا رسولؐ دونوں لشکروں کے درمیان گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں سربجود ہے اور اللہ سے گڑگڑا کر نصرت کی درخواست کر رہا ہے۔ پھر اُحد کا سخت مرحلہ بھی آیا۔ آپؐ کے دندان مبارک شہید اور چہرۂ انور لہولہان ہو گیا ہے۔ آپؐ پر کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ آپؐ کے

انتہائی جاں نثار ساتھی حضرت معصب بن عمیرؓ کالاشہ بے گور و کفن پڑا ہے کہ جسم پر موجود چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اسی میدانِ اُحد میں آپؐ کے انتہائی قریبی عزیز حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کا اعضاء بریدہ لاشہ پڑا ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے قلبِ مبارک کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے پر جب آپؐ نے دیکھا کہ گھر گھر سے رونے کی آوازیں آرہی ہیں، شہداء پر اُن کی رشتہ دار خواتین بین کر رہی ہیں، تو حضور ﷺ کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ آگئے : ((اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ)) "ہائے حمزہ کے لئے تو کوئی رونے والی بھی نہیں۔" یہ تمام صدمے حضور ﷺ نے دیکھے اور یہ سب سختیاں جھیلی ہیں، تب یہ انقلاب آیا ہے۔ گویا ؎ "اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری" کے مصداق اس عظیم انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم ﷺ کو اِن تمام مراحل اور مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا جو دنیا کی کسی بھی انقلابی جدّوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بہرکیف یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثت محمدیؐ کی یہی امتیازی شان ہمارے سامنے رہنی چاہئے جو اس آیت میں بیان ہوئی کہ : ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ پورے کے پورے دین (نظامِ اطاعت) پر اس دینِ حق کو غالب و قائم کر دینا یہ ہے بعثت محمدیؐ کی غرض و غایت!

دو چشم کشا واقعات

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ یہ چیز بعثت انبیاء کے اساسی مقصد سے جدا نہیں ہے۔ دیکھئے، بعثت انبیاء کا اصل مقصد نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہے۔ اور یہ اسی اتمامِ حجت کا تکمیلی مرحلہ ہے کہ انسان کو اجتماعی نظام کے ضمن میں رہنمائی کے لئے عدل و قسط پر مبنی نظام کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیا جائے۔ صرف نظری سطح پر پیش کر دینے سے وہ حجت مکمل نہیں ہو گی، بلکہ اتمامِ حجت کے لئے ضروری ہو گا کہ اس نظام کو بالفعل قائم و نافذ کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جائے۔ اس معاملے کی اہمیت کا حوالہ رواں صدی کے دو واقعات کے

حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں پہلی بار مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں اُس وقت یاد ہو گا کہ گاندھی نے اپنے کانگریسی ساتھیوں اور زعماء کے سامنے ایک عجیب بات کہی تھی' اور وہ یہ کہ "میں اس موقع پر تمہارے سامنے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال رکھتا ہوں' اس مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو!" غور کیجئے گاندھی نے یہ بات کیوں کہی! اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس عہدِ جدید کے انسان کو جس نوع کے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اس نظام کا ایک کامل نقشہ اور ایک مکمل ماڈل اگر درکار ہے تو اس کی نظیر تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے دورِ خلافت راشدہ' یعنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی جو قائم فرمایا تھا محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

ایک دوسرا واقعہ جو اس کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈال رہا ہے' مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے ہے۔ اس واقعے سے دین حق کے قیام و نفاذ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ مولانا سندھی جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ریشمی رومالوں کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان گئے' اور جب افغانستان سے بھی گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر سرحد عبور کر کے انہیں روس جانا پڑا تو اُس وقت بالشویک انقلاب ابھی نیا نیا آیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر انقلاب کے مرکزی رہنماؤں کے سامنے اگر اسلام کا انقلابی پروگرام رکھا جائے تو کیا عجب کہ وہ اس کو قبول کر لیں' ابھی ان میں انقلابی جذبہ بھی ہے اور انقلاب کے نقطۂ نظر سے فضا سازگار بھی ہے۔ چنانچہ اس امید میں انہوں نے لینن سے بات کرنا چاہی' لیکن لینن بستر مرگ پر تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ٹراٹسکی سے بات کیجئے' چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کی ٹراٹسکی سے مفصل گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے آخر میں اس نے پوچھا کہ مولانا! یہ نظام جو آپ پیش کر رہے ہیں بظاہر بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے' لیکن کیا آپ نے دنیا میں کہیں اسے قائم بھی کیا ہے؟ مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری نگاہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئیں' دوبارہ میں اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکا۔ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی نظام حجت تب بنتا ہے جب اسے چلا کر دکھا دیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتمامِ حجت کو اپنے تکمیلی درجے تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے جہاں نظری' فکری اور اعتقادی ہدایت دی' انسان کی سوچ کو صحیح رخ پر

ڈالا' جہاں آپؐ نے انفرادی اخلاق کے ضمن میں انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ایک مکمل ہدایت نامہ عطا فرمایا' خود اپنی سیرت و کردار اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار کو اس رخ پر ڈھال کر انفرادی اخلاق کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے نوع انسانی پر حجت تمام کی' وہاں آپؐ نے ایک جاں گسل جدوجہد کے ذریعے تیئس سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں اس نظامِ عدل و قسط کو عملاً برپا کر دیا جس میں انفرادی آزادی بھی ہے' لیکن اجتماعیت کے حقوق بھی پورے طور پر محفوظ ہیں' جس میں مساواتِ انسانی بھی ہے' لیکن وہ freedom کی cost پر نہیں کہ مساوات تو ہو لیکن انسان شخصی آزادی سے یکسر محروم کر دیا جائے' بلکہ یہ دونوں اعلیٰ اقدار اس نظام میں بیک وقت موجود ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس اعلیٰ قدر کا تصور کرے گا اسے وہ اس نظام میں موجود پائے گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ست

یہ ہے اصل کارنامہ حیاتِ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کو سمجھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی اس امتیازی شان کا فہم ضروری ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں وارد ہوئی : ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾

وَاٰخِرُ دَعوانا اَنِ الحمدُ لِلّٰہ ربِّ العالمین

قرآن اکیڈمی کراچی کا نیا ای میل ایڈریس

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں کہ قرآن اکیڈمی کراچی کا نیا ای میل ایڈریس درج ذیل ہے :

quran@khi.fascom.com